

قصیدہ معراجیہ



کلام اعلیٰ حضرت، امام اہلسنت، مجدد دین و ملت الشاہ امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

وہ سرورِ کشور رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے سماں عرب کے مہمان کے لئے تھے

بہار ہے شادیاں مبارک چمن کو آبادیاں مبارک
ملک فلک اپنی اپنی لے میں یہ گھرِ عنادل کا بولتے تھے

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی بچی تھی دھوئیں
اُدھر سے انوار بہتے آتے اُدھر سے نجات اُٹھ رہے تھے

یہ چھوٹ پڑتی تھی ان کے رُخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے

نئی دِلہن کی پھین میں کعبہ نکھر کے سنورا سنور کے نکھرا
حجر کے صدقے کمر کے اک تل میں رنگ لاکھوں بناؤ کے تھے

نظر میں دولہا کے پیارے جلوے حیاء سے محراب سر جھکائے
سیاہ پردے کے منہ پر آنچلِ تجلی ذاتِ بحت کے تھے

خوشی کے بادل اُٹ کے آئے دلوں کے طاؤس رنگ لائے
وہ نعمۂ نعت کا سماں تھا حرم کو خود وجد آ رہے تھے

یہ جھوما میزاب زر کا جھومر کہ آ رہا کان پر ڈھلک کر
پھوہار برسی تو موتی جھڑ کر حطیم کی گود میں بھرے تھے

دِلہن کی خوشبو سے مست کپڑے نسیم گستاخ آنچلوں سے
غلاف مشکیں جو اُڑ رہا تھا غزال نافے بسا رہے تھے

پہاڑیوں کا وہ حسن تزئیں وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکین
صبا سے سبزہ میں لہریں آئیں دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے

نہا کے نہروں نے وہ چمکتا لباس آپ رواں کا پہنا
کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لپکا حبابِ تاباں کے تھل نکلے تھے

پرانا پُر داغ ملگجا تھا اُٹھا دیا فرش چاندنی کا
ہجومِ تارِ نگہ سے کوسوں قدم قدم فرشِ بادلے تھے

غبار بن کر نثار جائیں کہاں اب اُس رہ گزر کو پائیں
ہمارے دل حوریوں کی آنکھیں فرشتوں کے پَر جہاں بچھے تھے

خدا ہی دے صبرِ جانِ پُر غم دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم
جب اُن کو جھرمٹ میں لے کے قدسی جناں کا دولہا بنا رہے تھے

اتار کر اُن کے رُخ کا صدقہ یہ نور کا بٹ رہا تھا بازا
کہ چاند سورج چل چل کر جہیں کی خیرات مانگتے تھے

وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جو بن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لئے تھے

بچا جو تلووں کا اُن کے دھوون بنا وہ جنت کا رنگ و روغن
جنہوں نے دولہا کی پائی اترن وہ پھول گلزارِ نور کے تھے

خبر یہ تحویلِ مہر کی تھی کہ رُت سہانی گھڑی پھرے گی
وہاں کی پوشاکِ زیبِ تن کی یہاں کا جوڑا بڑھا چکے تھے

تجلی حق کا سہرا سر پر صلوة و تسلیم کی نچھاور
دو رویہ قدسی پرے جما کر کھڑے سلامی کے واسطے تھے

جو ہم بھی واں ہوتے خاکِ گلشن لپٹ کے قدموں سے لیتے اُترن
مگر کریں کیا نصیب میں تو یہ نامرادی کے دن لکھے تھے

ابھی نہ آئے تھے پشتِ زیں تک کہ سر ہوئی مغفرت کی شکل
صدا شفاعت نے دی مبارک گناہِ مستانہ جھومتے تھے

عجب نہ تھا رخس کا چمکنا غزالِ دم خوردہ سا بھڑکنا
شعاعیں نکلے اڑا رہی تھیں تڑپتے آنکھوں پہ صاعقے تھے

ہجومِ امید ہے گھاؤ مرادیں دے کر انہیں ہٹاؤ
ادب کی باگیں لئے بڑھاؤ ملائکہ میں یہ غلغلے تھے

اٹھی جو گردِ رہِ منور وہ نور برسا کہ راستے بھر
گھرے تھے بادل بھرے تھے جل تھل اُٹھ کے جنگل اُبل رہے تھے

ستم کیا کیسی مَت کٹی تھی قمر وہ خاک اُن کے رہ گزر کی
اُٹھا نہ لایا کہ ملتے ملتے یہ داغ سب دیکھنا مٹے تھے

بُراق کے نقشِ سُم کے صدقے وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن مہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

نمازِ اقصیٰ میں تھا یہی سرِ عیاں ہوں معنیِ اول و آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت آگے کر گئے تھے

یہ ان کی آمد کا دبدبہ تھا نکھار ہر شے کا ہو رہا تھا
نجوم و افلاک جام و مینا اُجالتے تھے کھنگالتے تھے

نقاب الٹے وہ مہرِ انور جلالِ رخسار گرمیوں پر
فلک کو ہیبت سے تپ چڑھی تھی بچکتے انجم کے آبلے تھے

یہ جوشِ نور کا اثر تھا کہ آبِ گوہر کمر کر تھا
صفائے رہ سے پھسل پھسل کر ستارے قدموں پر لوٹتے تھے

بڑھا یہ لہرا کے بحرِ وحدت کہ دھل گیا نامِ ریگ کثرت
فلک کے ٹیلوں کی کیا حقیقت یہ عرشِ کرسی دو بلبلے تھے

وہ ظلِ رحمت وہ رُخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زریفتِ اودیِ اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے

چلا وہ سروچھاں خراماں نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی وہ کب کے سب این و آں سے گزر چکے تھے

جھلک سی اک قدسیوں پر آئی ہوا بھی دامن کی پھر نہ پائی
سواری دولہا کی دور پہنچی برأت میں ہوش ہی گئے تھے

تھکے تھے روح الامیں کے بازو چھٹا وہ دامن کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی امید ٹوٹی نگاہ حسرت کے ولولے تھے

روش کی گرمی کو جس نے سوچا دماغ سے اک بھوکا پھوٹا

خرد کے جنگل میں پھول چکا دہر دہر پیڑ جل رہے تھے

جلو میں جو مرغ عقل اڑے تھے عجب بُرے حالوں گرتے پڑتے

وہ سدرہ ہی پر رہے تھے تھک کر چڑھا تھا دم تیور آگئے تھے

قوی تھے مرغانِ وہم کے پر اڑے تو اڑنے کو اور دم بھر

اُٹھائی سینے کی ایسی ٹھوکر کہ خون اندیشہ تھوکتے تھے

سنا یہ اتنے میں عرشِ حق نے کہ لے مبارک ہوں تاج والے

وہی قدم خیر سے پھر آئے جو پہلے تاج شرف ترے تھے

یہ سن کر بیخود پکار اُٹھا ثار جاؤں کہاں ہیں آقا

پھر ان کے تلوؤں کا پاؤں بوسہ یہ میری آنکھوں کے دن پھرے تھے

جھکا تھا مجھے کو عرشِ اعلیٰ گرے تھے سجدے میں بزم بالا

یہ آنکھیں قدموں سے مل رہا تھا وہ گرد قربان ہو رہے تھے

ضیائیں کچھ عرش پر یہ آئیں کہ ساری قندیلیں جھللائیں

حضورِ خورشید کیا چمکتے چراغ منہ اپنا دیکھتے تھے

یہی سماں تھا کہ پیکِ رحمت خبر یہ لایا کہ چلئے حضرت

تمہاری خاطر کشادہ ہیں جو کلیم پر بند راستے تھے

بڑھ اے محمد قریں ہو احمد، قریب آ سرورِ مجد

ثار جاؤں یہ کیا ندا تھی یہ کیا سماں تھا یہ کیا مزے تھے

تبارک اللہ شانِ تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی

کہیں تو وہ جوشِ لنِ ترانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

خرد سے کہہ دو کہ سر جھکالے گمان سے گذرے گزرنے والے

پڑے ہیں یاں خود جہت کو لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے

سراغِ این و مٹی کہاں تھا نشانِ کیف و الی کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی نہ سبِ منزل نہ مرلے تھے

اُدھر سے پیہم تقاضے آنا اُدھر تھا مشکل قدم بڑھانا
جلال و ہیبت کا سامنا تھا جمال و رحمت اُبھارتے تھے

بڑھے تو لیکن جھبکتے ڈرتے حیا سے جھکتے ادب سے رکتے
جو قرب اُنہیں کی روش پہ رکھتے تو لاکھوں منزل کے فاصلے تھے

پر اُن کا بڑھنا تو نام کو تھا حقیقۂ فعل تھا اُدھر کا
تزلزلوں میں ترقی افزا دنیٰ تدلی کے سلسلے تھے

ہوا یہ آخر کہ ایک بجزا تموجِ بحر ہو میں اُبھرا
دنیٰ کی گودی میں اُن کو لے کر فنا کے لنگر اٹھا دیئے تھے

کسے ملے گھاٹ کا کنارہ کدھر سے گزرا کہاں اتارا
بھرا جو مثلِ نظر طرارا وہ اپنی آنکھوں سے خود چھپے تھے

اُٹھے جو قصرِ دنیٰ کے پردے کوئی خبر دے تو کیا خبر دے
وہاں تو جا ہی نہیں دوئی کی نہ کہہ کہ وہ ہی نہ تھے ارے تھے

وہ باغِ کچھ ایسا رنگ لایا کہ غنچہ و گل کا فرق اٹھایا
گرہ میں کلیوں کی باغ پھولے گلوں کے تئیں لگے ہوئے تھے

محیط و مرکز میں فرق مشکل رہے نہ فاصلِ خطوطِ واصل
کمانیں حیرت سے سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے

حجاب اُٹھنے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقتِ جنم کے پچھڑے گلے ملے تھے

زبانیں سوکھی دکھا کے موجیں تڑپ رہی تھیں کہ پانی پائیں
بھنور کو یہ ضعفِ تشنگی تھا کہ حلتے آنکھوں میں پڑ گئے تھے

وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اُسی کے جلوے اُسی سے ملنے اُسی سے اس کی طرف گئے تھے

کمانِ امکان کے جھوٹے نقطو تم اول آخر کے پھیر میں ہو
محیط کی چال سے تو پوچھو کدھر سے آئے کدھر گئے تھے

ادھر سے تھیں نذرِ شہِ نمازیں ادھر سے انعامِ خسروی میں
سلام و رحمت کے ہار گندھ کر گلوئے پر نور میں پڑے تھے

زبان کو انتظارِ گفتن تو گوش کو حسرتِ شنیدن
یہاں جو کہنا تھا کہہ لیا تھا جو بات سنی تھی سن چکے تھے

وہ برجِ بطحا کا ماہ پارہ بہشت کی سیر کو سدھارا
چمک پہ تھا خلد کا ستارہ کہ اس قمر کے قدم گئے تھے

سرورِ مقدم کی روشنی تھی کہ تابشوں سے مہِ عرب کی
جناں کے گلشن تھے جھاڑِ فرشی جو پھول تھے سب کنول بنے تھے

طرب کی نازش کہ ہاں لپکتے ادب وہ بندش کہ ہل نہ سکیئے
یہ جوشِ ضدین تھا کہ پودے کشاکشِ اڑہ کے تلے تھے

خدا کی قدرت کہ چاند حق کے کروڑوں منزل میں جلوہ کر کے
ابھی نہ تاروں کی چھاؤں بدلی کہ نور کے تڑکے آئے تھے

نبی رحمت شفیع امتِ رضا پہ للہ ہو عنایت
اسے بھی ان خلقتوں سے حصہ جو خاصِ رحمت کے واں بٹے تھے

نمائے سرکار ہے وظیفہ قبولِ سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا ردی تھی کیا کیسے قافیہ تھے